ڈاکٹر طاہرہ صدیقہ
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، کنئیر ڈ کالج، لاہور

اردو تنقید اور سلیم احمد کی تنقیدی انفرادیت

Abstract

Saleem Ahmed is a contemporary prominent critic. There is a rich critical tradition in the history of Urdu literature. He has a deep influence on creative and critical literature. His views about literature and literary figures can be challenged but his importance as a critic cannot be denied. This research discussed the originality, critical approach and critical technique of Saleem Ahmed.

Keywords: Criticism, Originality, Literary Comitment, Different Approach, Genuine Writer (poet and critic)

سلیم احمد کا عہدِ حاضر کے اہم نقادوں میں شمار ہوتا ہے جنھوں نے جدید اُردو ادب کی تاریخ میں بیک وقت تنقیدی اور تخلیقی سطحوں پر اپنے عہد کو متاثر کیا ہے۔ اُنھوں نے تنقیدی نظریات ورُجحانات پر بھی اظہارِ خیال کیا اور عملی تنقید میں بھی کارِ نمایاں انجام دیے۔ وہ جتنے اہم تخلیق کار ہیں اُتنے ہی اہم نقاد بھی ہیں۔ سلیم احمد کی شخصیت، اُن کی شاعری اور اُن کی تنقید میں بڑا پھیلاؤ ہے۔ شاعر کی حیثیت سے اُنھوں نے زندگی کے حقائق کا اور نقاد کی حیثیت سے ادبی حقائق کا سراغ لگانے، انھیں سمجھنے اور سمجھانے کی جو کوشش کی ہے، اُس کی اہمیت سے انکار درکنار، اقرار نہ کرنا بھی ادبی بددیانتی ہو گی۔ سلیم احمد حقیقتاً ایک رُجحان ساز ادیب تھے، اُنھوں نے اظہارِ خیال کے سلسلے میں بھی کسی پابندی کو ملحوظ نہیں رکھا، ماسوائے اس امر کے کہ جو کچھ تخلیق کیا جائے وہ ادبی پیرائے میں ہو نہ کہ غیر ادبی اسلوب میں۔ گویا اُن کے نزدیک ادب کو ادب ہونا چاہیے، نظریہ سازی اور سیاست گردی ضمنی باتیں ہیں اور یہ ادب کے اعلیٰ معیار کی ضامن نہیں ہو سکتیں۔ پاکستان کی ادبی تاریخ میں سلیم احمد کی تخلیقی اور تنقیدی کاوشیں بے حد معنی ہیں۔

سلیم احمد تنقید میں جس اعلیٰ معیار کے خواہاں تھے، اس پر اُن کی تخلیق پوری اترتی ہے۔ عہد حاضر میں سلیم احمد نے کسی خارجی عنصر کے بجائے ادب سے وابستگی کی نہایت عمدہ مثال قائم کی ہے۔ دراصل اُن کی تنقید اُن کی تخلیقی شخصیت کے اظہار کا ایک پیرایہ ہے۔ سلیم احمد کے نقطہ نظر سے چاہی کوئی اختلاف کیوں نہ کرے، جن سوالات کے قریب وہ ہمیں پہنچاتے ہیں، اُن سے کوئی بامعنی رشتہ قائم کیے بغیر ہم اپنے فکری اور ادبی ماحول کی چند بنیادی اور جوہری سچائیوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ ن۔ م۔ راشدؔ نے ایک بار اپنے ایک مکتوب میں سلیم احمد کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا تھا کہ سلیم احمد اُردو کا واحد اور یجنل نقاد ہے۔ اور یجنل نقاد سے راشدؔ کی مراد یہ نہیں تھی کہ سلیم احمد کا سارا تنقیدی نظریہ اور انتقادی فکر وہبی تھی یا اُنھوں نے کوئی نیا تنقیدی اصول اور فکری نظام وضع کیا تھا بلکہ اُن کی مراد یہ تھی کہ سلیم احمد اُن ناقدین سے مختلف ہیں جو عام طور پر مغربی نقادوں کی آرا اور تنقیدی اصولوں کا مطالعہ کر کے انھیں اُردو میں جابرانہ طور پر منطبق کرتے ہیں۔ نقطہ نظر میں اور یجنلٹی ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اصل اہمیت ناقدانہ بصیرت اور ادب کی تفہیم و تعبیر کی ہے۔ کوئی ادیب، شاعر یا نقاد اپنے عصر سے جو کچھ حاصل کرتا ہے وہ اس میں اپنی جانب سے کتنا اضافہ کرتا ہے یا اپنی الگ ڈگر اور اپنی انفرادیت قائم کرنے میں کس حد تک کامیاب رہتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو سلیم احمد کو اُردو ادب کا ایک اہم نقاد کہا جا سکتا ہے۔

سلیم احمد مغربی تنقیدی اصولوں کو اپنا حوالہ نہیں بناتے۔ اُنھوں نے جدید و قدیم علوم و فنون کا جس حد تک مطالعہ کیا وہ زیادہ تر عربی و فارسی اور اُردو کے ذریعے سے ہی کیا اور یہ اُن کے حق میں بہتر ہی ہوا۔ یوں وہ عام ناقدین سے الگ ڈگر بنانے اور زندگی اور ادب کی غرض و غایت کے بارے میں اپنے انداز سے غور کرنے کے عادی ہو گئے۔

سلیم احمد فطری طور پر نکتہ سنج واقع ہوئے تھے۔ اُنھیں زندگی اور ادب کے ہر پہلو اور ہر نکتے پر غور کرنے، نت نئے سوالات اُٹھانے اور بحث و مباحثہ کرنے کی عادت تھی اور اس میں اُنھیں لطف بھی آتا تھا۔ اسی عادت نے اُنھیں آج کے تمام ناقدین سے مختلف بنا دیا تھا۔ سلیم احمد نے ادب و سیاست، مذہب و معاشرت اور فلسفہ و معیشت سے متعلق اپنی زندگی میں جتنے سوالات اُٹھائے، اُتنے ان کے استادِ معنوی محمد حسن عسکری نے بھی نہیں اُٹھائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سلیم احمد پیشہ ور مصنف تھے۔ اُنھیں اظہار کے جتنے ذرائع میسر تھے اتنے محمد حسن عسکری کو نہیں تھے۔ اسی لیے ان کی مجموعی ادبی تحریریں سلیم احمد سے کہیں کم ہیں۔ سلیم احمد نے ہر ذریعہ ابلاغ

اور ہر صنف میں کھل کر اظہار کیا۔ وہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ اُنھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں اور اصنافِ ادب میں طبع آزمائی کی ہے۔

ڈاکٹر سہیل احمد خان اپنی کتاب ''طرفیں'' میں شامل اپنی تقریر سلیم احمد کی ادبی تنقید میں سلیم احمد کے حوالے سے اپنے احساس کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> وہ ہماری چند ان سنجیدہ ادبی شخصیتوں میں سے تھے جنھوں نے اپنے تخلیقی اور تنقیدی امکانات کو شناخت کیا۔ اس شناخت اور تلاش کے عمل میں اپنی روحانی کشمکش کو سمجھنے کی کوشش کی اور پھر بڑی ریاضت اور بڑے جتن سے امکانات کے اس دائرے کو تا حدِ نظر پھیلانے کی کوشش کی۔ یہ ریاضت کوئی معمولی چیز نہیں اور اس کے بغیر فطری صلاحیتیں بھی زیادہ دُور تک مدد نہیں کرتیں۔ ۱

''ادھوری جدیدیت'' کے دیباچے میں سلیم احمد نے اپنی جانب اشارہ کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ میں تو ابھی تلاش کر رہا ہوں۔ لیکن یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ اپنے بیشتر ہمعصر نقادوں کی طرح وہ بھی بہت جلد عافیت پسندی یا خود اطمینانی کا شکار نہیں ہو گئے۔ شاید اس کا سبب یہ بھی ہے کہ سلیم احمد مضطرب آدمی تھے اور یہ اضطراب اُن کی تحریروں میں ایک آتشیں لہر کی مانند چمکتا ہے۔ اپنی تنقیدی کتاب ''نئی نظم اور پورا آدمی'' کے دیباچے میں اُنھوں نے بتایا ہے کہ کہ یہ مضامین میں نے حالتِ اضطراب میں لکھے ہیں۔ اسی طرح اپنے اسلوب کی وضاحت کرتے ہوئے اُنھوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ جس طرح نطشے کے زرتشت کو نٹ کا تماشا دکھانا پڑا اسی طرح یہ بھی لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے ہے۔ اسی طرح اپنی دیگر کتب میں بھی سلیم احمد جو ادبی اور فکری سوالات اُٹھاتے ہیں صاف اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تنقید کی پیشہ وارانہ ضروریات سے نہیں پُھوٹے بلکہ ان کے پیچھے نقاد کی برسوں کی مسلسل سوچ کارفرما ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر ''اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' میں رقمطراز ہیں:

> سلیم احمد کی تنقیدی صلاحیتوں سے انکار ممکن نہیں مگر انھوں نے عسکری کے اسلوب کی شوخی اور تازگی کو سستی فقرہ بازی میں تبدیل کر کے خود اپنی انفرادیت گنوا دی۔ اسی لیے بعض اوقات ان کی تنقید محض سنسنی خیزی اور عبارت چٹکلہ بازی بن کر رہ جاتی ہے۔ ۲

سلیم احمد کا ذکر اُردو کے نفسیاتی ناقدین کے ساتھ بھی لیا جاتا ہے کیونکہ اُنھوں نے اپنی تنقید میں نفسیات کے علم سے بہت فائدہ اُٹھایا ہے۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ اس معاملے میں وہ انتہا پسندی کا شکار بھی ہوئے ہیں۔ اپنی تصنیف

''نئی نظم اور پورا آدمی'' میں اُنھوں نے کھل کر اس مسئلے پر اظہارِ خیال کیا ہے کہ لاشعور میں پلنے والی ناقابلِ ذکر خواہشات سے نگاہیں چُرانے کے بجائے کوشش کر کے اُنھیں شعور کی سطح تک لانا اور پھر ان کا اظہار کرنا چاہیے ورنہ ذہن مریضانہ ہو جائے گا اور اس ذہن سے پیدا ہونے والی تخلیقات بھی مریضانہ ہی ہوں گی۔

سلیم احمد کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا اور اُن کی بہت مخالفت کی گئی مگر انھیں اس کا گلہ نہیں۔ وہ اختلاف کو پسند کرتے ہیں بشرطیکہ یہ اختلاف دیانت داری کے ساتھ کیا جائے۔ ''نئی نظم اور پورا آدمی'' کے دیباچے میں اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ان مضامین میں جو زاویۂ نظر اختیار کیا گیا ہے ،اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ کیا جانا چاہیے۔ پڑھنے والا صرف مردہ خیال سے اختلاف نہیں کرتا۔ ہو سکتا ہے
> کہ آخر میں آپ ان مضامین کو بالکل کھوٹا سکّہ قرار دیں۔ لیکن ذاتی طور پر مجھے یہ اعتماد ہے کہ میں جعلی سکّہ ساز نہیں ہوں۔ ساتھ ہی میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ ہر دور میں ایک آدمی ایسا موجود ہوتا ہے جو کھرے اور کھوٹے میں امتیاز کر سکتا ہے۔ میں نے اپنی یہ ناچیز تحریریں اسی ایک آدمی کے لیے لکھی ہیں۔ ۳

سلیم احمد کی مخالفت کے دو سبب ہیں ایک تو یہ کہ اُن کے نظریات میں زبردست تبدیلی واقع ہوئی جسے لوگوں نے مصلحتِ وقت سمجھ کر ناپسند کیا۔ جیسا کہ وہ شروع میں ادب کی سماجی اہمیت کے قائل تھے اور اسے تنقیدِ حیات بتاتے تھے۔ اپنی اولین تصنیف میں اُنھوں نے ادب کے لیے عصری سعور کو لازم قرار دیا تھا۔ بعد ازاں وہ اپنے اس موقف پر قائم نہ رہے اور آگے چل کر وہ ادب کی بے مقصدیت کے علم بردار ہو گئے۔ اپنے مضمون ''ادبی اقدار'' میں وہ ادب کو سماجی اور اجتماعی ذمہ داریوں سے آزاد اور مبرّا قرار دیتے ہیں۔ اس کا سبب نہ بد دیانتی ہے نہ مصلحت اندیشی۔ سلیم احمد کی ذہنی تربیت میں محمد حسن عسکری کا بڑا ہاتھ ہے جنھیں وہ اپنا روحانی و معنوی مرشد تسیم کرتے ہیں۔ سلیم احمد کے افکار میں جو انقلاب آیا وہ اسی راستے سے آیا اور رینے گینوں سے اُن کی شناسائی بھی اسی مرشد کے ذریعے سے ہوئی۔ چنانچہ حسن عسکری اور سلیم احمد کے خیالات میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے مگر سلیم احمد محض حسن عسکری کے ضمیمہ اور بازگشت نہیں تھے۔ اس میں البتہ کوئی شُبہ نہیں کہ وہ محمد حسن عسکری کے سب سے اچھے اور کامیاب مفسّر تھے۔ سلیم احمد میں خود اتنی زبردست ناقدانہ صلاحیت تھی کہ عسکری مرحوم کی تائید و حمایت میں بہت کچھ لکھنے کے باوجود وہ دنیائے ادب سے اپنی آزاد اور مُنفرد حیثیت تسلیم کروانے میں کامیاب رہے۔

اس کا ثبوت اُن کی کتب ''غالب کون؟''اور ''اقبال-ایک شاعر''ہیں۔ غالبؔ اور اقبالؔ صدی کے موقع پر ان دونوں عظیم المرتبت شعرا پر ہزاروں کتب شائع ہوئیں لیکن ان دونوں تصانیف نے جس طرح ادبی اور علمی حلقوں کی جانب سے خراجِ تحسین وصول کیا وہ بحیثیت نقاد سلیم احمد کی کامیابی کا بین ثبوت ہے۔

سلیم احمد کی مخالفت کا دوسرا سبب اُن کا اندازِ بیان ہے، جسے غیر علمی، غیر سنجیدہ اور زہر ناک جیسے نام دیے گئے۔ کہا گیا کہ وہ تنقید نہیں کرتے فقرے بازی کرتے ہیں، پھبتیاں کستے ہیں اور یہ کہ اُن کے مزاج میں ایک خاص قسم کی آزار پسندی ہے وہ دوسروں کو تکلیف پہنچا کر لُطف اندوز ہوتے ہیں۔ دراصل سلیم احمد کی شخصیت میں ایک طنز نگار پوشیدہ ہے۔ان کی ناپسندیدگی عموماً طنز آمیز تنقیدی جملوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے، جس سے اُن کی بات میں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ موضوع تو یقیناً روشن ہو جاتا ہے مگر جس پر وار ہوا ہو، وہ ضرور تلملا اُٹھتا ہے۔

سلیم احمد ۱۸۵۷ء سے قبل کے معاشرے کو روایتی معاشرہ قرار دیتے ہیں، جس میں ایک وحدت کارفرما تھی۔اُن کا خیال تھا کہ یہ تہذیبی وحدت ۱۸۵۷ء کے بعد ٹوٹ گئی اور کسی مجموعی تہذیبی طرزِ احساس کے بجائے اس طرزِ احساس کی کٹی پھٹی شکل باقی رہ گئی۔ پھر اس کے بعد مختلف تحریکوں یا افراد نے کسی ایک شکستہ ٹکڑے میں اپنا عکس دیکھا اور اسے مکمل سمجھ لیا۔ حالانکہ یہ عکس ادھورا تھا۔اس بنیادی کُلیے یا تصور کو لے کر سلیم احمد نے نئے ادب کا تجزیہ کیا ہے۔ ''نئی نظم اور پورا آدمی''میں اُنھوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد پیدا ہونے والے آدمی کو ''کسری آدمی''کہا ہے۔ سلیم احمد کا یہ مضمون بے حد وقیع اور اُن کی تنقیدی صلاحیتوں کا بھرپور ترجمان بھی ہے۔ڈاکٹر سہیل احمد خان اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> سلیم احمد جس کُلیے کو لے کر چلے اس کا انھوں نے ہمارے ادب پر بھرپور اطلاق کر کے دکھایا اور یوں ہمیں اپنے تنقیدی نظام سے متعارف کروایا۔اس تنقیدی نظام میں ایک۔۔۔۱۸۵۷ء کے بعد طرزِ احساس کی بنیادی تبدیلیوں کو سمجھنے کی کوشش اور دوسرے پورے آدمی کا تصور جسے وہ ادب کی مختلف شکلوں میں تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ آدمی کا کوئی تصور رکھے بغیر نہ تو ادب وُسعت اختیار کرتا ہے اور نہ ہی تنقید۔۔۔ان کی تنقید بنیادی طور پر آدمی کی تلاش کا سفر ہے۔[۴]

سلیم احمد نے اپنے مضمون ''چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے''میں اُردو شاعری میں انسان کی جو مختلف شکلیں گنوائی ہیں، ان میں انسان بطور عاشق (جس کی جگر کاوی میرؔ کے نشتر بن گئی) انسان بطور فرد (غالبؔ) انسان بطور تماشائی (نظیرؔ) اور انسان بطور ایک تخلیقی وجود (اقبالؔ) ہیں۔ میر انیسؔ کے یہاں انھیں انسان اپنے

خاندانی رشتوں میں دکھائی دیتا ہے اور یہ میر انیسؔ کی شاعری کی تفہیم میں ایک نادر جہت کا اضافہ ہے۔ سلیم احمد نے اس تصور کی مدد سے بعض رویوں کو سمجھا ہے اور بعض شعرا کی تفہیم کی نئی راہیں بھی نکالی ہیں۔

سلیم احمد اور اس دائرے کے دیگر ناقدین کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے روایت کا صحیح احساس پیدا کرنے کی کوشش کی اور یوں جدیدیت کے ایک بے مہار تصور کے انتہا پسندانہ پہلوؤں کی جانب توجہ دلائی۔ جس کی وجہ سے ایک نیا تہذیبی توازن قائم ہوا۔ روایت کے سلسلے میں پہلے تو ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا شعورِ ماضی ہمارے ناقدین کے لیے قابلِ توجہ ٹھہرا مگر پھر سلیم احمد محمد حسن عسکری کے ہمراہ چلتے ہوئے رینے گینوں کی وساطت سے روایت کے اُس گہرے تصور تک پہنچ گئے جو مشرقی تہذیبوں کے باطن میں جاری و ساری ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سہیل احمد خان کا کہنا ہے:

> سلیم احمد ہمارے تہذیبی طرزِ احساس کے سمندر کے وہ شناور ہیں جو بہت گہرائی تک غوطہ لگانے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اس گہرائی سے ادبی بصیرت کے وہ لعل و گوہر تک کھینچ لاتے ہیں جو ان کے تنقیدی مضامین میں چکاچوند پیدا کرتی ہے۔ ۵

سلیم احمد ہر فنکار کی شخصیت میں پوشیدہ کشمکش کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جیسے مرزا غالبؔ کے یہاں انا کے تصور اور انا کی قربانی تہہ کر سکنے کے رویے کو وہ بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ جوش ملیح آبادی کی شخصیت میں پوشیدہ جوشؔ کی مختلف اشکال کو نکالتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح اقبالؔ کے تصورِ مرگ کو بنیاد بنا کر ان کی شخصیت اور شاعری کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اس بنیادی رویے کی جانب ان کے نفسیات سے خصوصی شغف کا بھی دخل ہو سکتا ہے یا یہ چیز ان کی تجزیہ کارانہ صلاحیتوں کا کرشمہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ معروضی انداز میں فنکار کی روحانی کشمکش کا تجزیہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنے استاد محمد حسن عسکری کی تنقید کا تجزیہ بھی وہ اُن کی شخصیت میں چُھپی ہوئی آدمی یا انسان کی کشمکش کے حوالے سے کرتے ہیں۔ یہ چیز ان فنکاروں کی تفہیم کے لیے ایک نیا تناظر فراہم کرتی ہے لیکن یہ بات ضرور مُضطرب کرتی ہے کہ سلیم احمد جو رومانی نقطہ نظر کے اس قدر مخالف ہیں بنیادی اہمیت شخصیت ہی کے مسئلے کو دیتے ہیں۔ اگرچہ اُن کا تنقیدی اندازِ نظر رومانی ناقدین سے بہت مختلف ہے مگر مرکز تو فنکار کی شخصیت ہی رہتی ہے۔

سلیم احمد کی توجہ شعری روایت پر ہی زیادہ مرکوز رہی۔ ناول یا افسانے سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی وغیرہ کے مختصر ذکر کو چھوڑ کر، ان کی توجہ کا مرکز نہ بن سکے۔ طرزِ احساس کی جن تبدیلیوں کو دکھانا سلیم احمد کا مقصد تھا، وہ شعری روایت میں زیادہ بنیادی سوالات کے طور پر موجود ہیں۔ لہٰذا وہ اُنھیں فکشن کی نسبت زیادہ پُر

کشش محسوس ہوتی ہے۔ حفیظ ہوشیار پوری اور دیگر شعرا کے تجزیے، ممتاز حسین کی کتاب ''ادب و شعور'' اور ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب ''اُردو شاعری کا مزاج'' پر جو تفصیلی تبصرے سلیم احمد نے کیے، نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔

سلیم احمد کی تصنیف ''اقبال-ایک شاعر'' کے مطالعہ کے بعد بعض ادبی حلقوں نے اس کتاب کو اقبالؔ کے خلاف تصنیف قرار دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سلیم احمد نے اقبالؔ کے دیگر ناقدین یا روایتی ناقدین کی مانند محض اقبالؔ کی مدح و ستائش نہیں کی بلکہ بعض اہم نکتے بھی اُٹھائے اور بعض اعتراضات بھی کیے۔ اُن کے نزدیک اُن کی اقبالؔ سے لڑائی اُن کے اقبالؔ سے عشق کے نتیجے میں ہے اور اس عشق اور تعلق کو اقبالؔ کے مجاور اور تاجر نہیں سمجھ سکتے۔

اقبال-ایک شاعر'' کے آغاز میں پروفیسر کرار حسین کا تنقیدی تجزیہ بھی شامل ہے۔ اُنھوں نے سلیم احمد کے اقبالؔ کی شاعری کے سرچشمے کو موت کی خواہش میں تلاش کرنے کو درست قرار دیا ہے مگر سلیم احمد کے فکر و عمل کی بحث سے پوری طرح متفق نہیں ہوئے۔ کرار حسین کے نزدیک سلیم احمد نے حرکت و سکون اور اثباتِ خودی و نفی خودی کے ضمن میں کچھ ایسی حقیقتوں کا اظہار کیا ہے، جن کا اظہار کرنا بہت ضروری تھا۔ اسی طرح انھوں نے کائنات کی تعریف اور اسلامی کائنات کی تصویر بہت صحت کے ساتھ اُتاری ہے۔ ''مسجد قرطبہ'' پر سلیم احمد کے مضمون کو کرار حسین نے تنقید کا اعلیٰ شاہکار قرار دیا ہے، جس میں تجزیہ اور تخیل ایک دوسرے کی مدد کر کے قاری کی حقیقت تک رہنمائی کرتے ہیں۔ کتاب کے آخر میں اقبالؔ کے دو اہم کرداروں ابلیس اور شاہین پر دلچسپ گفتگو کی گئی ہے۔

سلیم احمد کے نزدیک اقبالؔ کے نظریات کے تضادات کا احساس اب لوگوں میں آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت سے پردے از خود اُٹھتے چلے جائیں گے۔ اُن کے مطابق خطبات اور اقبالؔ کی شاعری میں عشق اور عقل کا جو تضاد نظر آتا ہے، وہ اس قدر واضح اور واشگاف ہے کہ اس پر کسی تاویل کے پردے نہیں ڈالے جا سکتے۔

سلیم احمد کا کہنا ہے کہ اقبالؔ پر اب تک جو کچھ بھی لکھا گیا ہے، اُس کا نوے فی صد حصہ اقبالؔ کے خیالات اور نظریات کی تشریحات پر مشتمل ہے۔ ان تحریروں میں وہ دو قسم کے بنیادی نقائص کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اولاً یہ کہ یہ تحریریں عام طور پر اقبالؔ کی شاعری کو زیرِ بحث نہیں لاتیں۔ دوسرا نقص یہ کہ ان میں اقبالؔ کے خیالات و نظریات کو بنی بنائی چیزوں کی طرح پیش کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں اقبالؔ کے تجربات کو بھی پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ان خیالات کے پیچھے گوشت پوست کے انسان کا وجود ہے، جس کی حسّی، جذباتی اور ذہنی

زندگی ان خیالات میں ظاہر ہوتی ہے۔ لہٰذا ان خیالات کو یوں نہیں دیکھا جا سکتا جیسے یہ اقبالؔ سے الگ وجود رکھتے ہوں۔ اقبالؔ کے خیالات کو اُن کی انفرادیت سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس ضمن میں سلیم احمد خود لکھتے ہیں:

> اقبالؔ کے تقریباً سارے شارحین اقبال کے خیالات کی عمومیت کو تو ظاہر کرتے ہیں لیکن ان کی انفرادیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں، حالانکہ ادبی تنقید کے لیے سب سے اہم چیز یہی انفرادیت ہے۔ اس کے علاوہ ان خیالات کو ان کے مخصوص زمانی اور مکانی پس منظر سے الگ کر کے دیکھنا اور بنی بنائی صداقتوں کے طور پر پیش کرنا بھی ان خیالات کو ان کی زندگی سے محروم کر دینے کے مترادف ہے۔ ۶

سلیم احمد کے نزدیک ضرورت اس امر کی ہے کہ اقبالؔ کے خیالات کو اقبالؔ کی زندگی کی روشنی میں دیکھا جائے اور اُن کی زندگی کو اُن کے خیالات کی روشنی میں۔ ان دونوں کو ملا کر ہی اقبال کو، پورے اقبال کو اُس طرح سمجھا جا سکتا ہے جیسا کہ اقبالؔ کے تخلیقی مطالعہ کے لیے ضروری ہے۔

سلیم احمد اگر اقبالؔ کے عاشق تھے تو ساتھ ہی ان کے ناقد بھی تھے۔ اس لیے اقبالؔ کے حوالے سے سلیم احمد کے خیالات کو درست تناظر میں سمجھے بغیر ان پر اقبالؔ دشمنی کا الزام عائد کرنا غلط ہے۔ سلیم احمد کے نزدیک اقبالیات میں اقبالؔ کا مطالعہ بیشتر اس طرح کیا جاتا ہے جیسے وہ اپنی زبان اور تہذیب کی روایت سے الگ تھلگ ایک جزیرے کی حیثیت رکھتے ہوں۔ وہ اقبالؔ کو اردو یا فارسی کے بڑے شعرا کے ساتھ رکھ کر دیکھنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اقبالؔ کی شاعری میں ان کے اندر کے انسان کی تلاش پر زور دیتے ہیں۔ اسطرح ہم اقبال کی فکر اور فلسفے کو زیادہ بہتر انداز میں سمجھ سکیں گے۔

بنیادی طور پر سلیم احمد نے ایک سوال اٹھایا ہے کہ اقبالؔ کے باطن میں اقبالؔ کی شاعری کا سرچشمہ کہاں ہے۔ اُنھوں نے اقبالؔ کی شاعری کی بنیاد ان کے تجربے کی گہرائی میں اُتر کر تلاش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اسے حرفِ آخر قرار نہیں دیا۔ اُنھیں اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ ان سے بہت سے لوگ اختلاف کریں گے۔ ان کی خواہش اور کوشش یہی تھی کہ اقبالؔ کو شاعر سمجھ کر ان کی شاعرانہ حقیقت اور حیثیت کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

سلیم احمد کی کتاب ''نئی نظم اور پورا آدمی'' اس لیے اہم ہے کہ اس میں انھوں نے پورے آدمی کا تصور پیش کیا ہے اور اس حوالے سے نئی نظم اور نئے شعرا کے فن کی قدر و قیمت کا تعین کیا ہے۔ اُن کے نزدیک جدید نظم کے اماموں کی حیثیت سے راشدؔ اور میراجیؔ کی تاریخی حیثیت سے اختلاف کیا جائے یا اتفاق، اردو زبان کی تاریخ میں

شاعری کی ایک نئی روایت قائم ہو گئی ہے۔اب اس روایت کو تاریخی تسلسل سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ بعض نقادوں کے خیال کے مطابق یہ روایت آگے نہ بھی جائے پھر بھی تاریخ میں اس کی ایک جگہ متعین ہو گئی ہے۔اس کے معنی یہ ہوئے کہ نئی نظم کا یہ سلسلہ جب تک چلتا رہے گا، خواہ دس برس یا ہزار برس، راشدؔ اور میرا جی کو اپنی جگہ سے ہلانے والا کوئی نہیں۔

سلیم احمد نے راشدؔ کی شاعری کے ابتدائی حصہ پر اختر شیرانی کی رومانیت کا اثر نمایاں کرتے ہوئے راشدؔ کی شاعری کو پورے آدمی کی شاعری ثابت کیا ہے۔اُن کا کہنا ہے:

> اشدؔ کا یہ کارنامہ کیا کم ہے کہ نئی نظم کی روایت میں پہلی بار اس نے ہمیں وہ پورا عمل دکھایا جس کے ذریعے ہم رومانیت اور کسری آدمی کے بھتوں سے نجات پا سکتے ہیں۔ان معنوں میں راشدؔ کی ''ماورا'' صرف نئی نظم ہی میں ہی نہیں، پوری اُردو شاعری (اگر اسے ایک مکمل تاریخی تسلسل کی روشنی میں دیکھا جائے) میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔۔۔۔ جس میں کسری آدمی کے بجائے پُورا آدمی بولتا ہے۔ ۷

سلیم احمد نے میرا جی کی شاعری کا تنقیدی تجزیہ پیش کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا کہ میرا جی نے بیک وقت کسری آدمی اور پُورے آدمی کو ایک دوسرے کے تقابل میں رکھ کر دیکھا اور کسری آدمی کی پیدائش کی مختلف صورتوں پر غور کیا ہے۔ میرا جی وہ تنہا شاعر تھا، جس کی ذات میں اُس زمانے کی مخصوص روح اس کھوئی ہوئی ہم آہنگی کو تلاش کر رہی تھی، جسے ہم نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں کہیں گم کر دیا اور جسے ہم اب تک نہیں پا سکے۔ بلکہ شاید اس کی تلاش بھی فراموش کر بیٹھے ہیں۔اپنے عہد کے مخصوص آدمی کی تمام اشکال دیکھنے اور پھر اُنھیں اپنے پورے آدمی کے معیار پر پرکھنے کی جیسی صلاحیت میرا جی میں تھی، اُن کے زمانے کے کسی اور شاعر میں نہیں تھی۔

سلیم احمد کی کتاب ''نئی شاعری اور نامقبول شاعری'' کا ایک بڑا حصہ شاعری میں ر ابطے اور ابلاغ کے مسائل سے متعلق ہے۔اُن کے مضامین '' نئی شاعری نامقبول شاعری''، ''ابہام کیوں''، ''ابہام اور بازی گری''، ''ابلاغ کا مسئلہ'' وغیرہ ستر یا اسی کی دہائی میں لکھے گئے تھے۔ یہ مضامین دراصل نئی شاعری اور نئے ادب کی ۱۹۶۰ء کی لسانی تشکیلات کی تحریک کا واضح رد عمل ہیں۔ اگرچہ سلیم احمد نے کہیں اس تحریک کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی ان نظری مضامین کا حوالہ دیا ہے، جو اس عہد کے نظریہ ساز ناقدین نے تحریر کیے۔اس کے باوجود اُنھوں نے ایسے مسائل کا اظہار کیا جن سے نئے ادبی معیارات کی تردید ممکن ہو سکے۔ادبی تاریخ کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ سارے مسائل سلیم احمد کے یہاں سرسری وجود کے حامل ہیں۔ نئی شاعری کی تحریک سے وابستہ شعرا اور

ناقدین کے نزدیک ان مضامین میں سے اکثر میں محض اِدھر اُدھر کی باتیں، ذاتی تعصّبات کا اظہار اور فقرے بازی کی گئی ہے۔ مزید یہ کہ وہ بات سے بات نکالتے ہیں۔ یوں بات سے بات تو شروع ہو جاتی ہے مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ نئی شاعری کی تحریک سے وابستہ نئے شاعر، نقاد، اور ناول نگار وافسانہ نگار افتخار جالب کے رفیق ڈاکٹر انیس ناگی سلیم احمد کے بے حد طویل مضمون ''نئی شاعری نامقبول شاعری'' پر تنقید کرتے ہوئے سلیم احمد کی تنقید کو محمد حسن عسکری کی تنقید کا انداز قرار دیتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ محمد حسن عسکری اور اُن کے شاگرد نقاد اپنی باتیں مغربی ادیبوں، مفکروں اور شعرا کے حوالے سے شروع کر کے لکھنؤ اور دہلی کے اوسط درجہ کے شعرا کو معتبر حوالہ بنا کر ایسے نتائج پیش کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ یہ تمام نقاد خصوصاً سلیم احمد روایت پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں مگر تمام باجماعت ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے تصورات کو الفاظ کے ہیر پھیر کے بعد نقل کرتے ہیں۔ انیس ناگی مزید لکھتے ہیں:

> ۱۹۶۰ء کی شاعری کی تحریک سے پیدا ہونے والے ادب کو سلیم احمد نے دانستہ طور پر نظر انداز کیا کیونکہ یہ تحریک پرانی روایت سے انحراف اور نئی ادبی اور شعری روایت پر اصرار کرتی تھی۔ ان کا طویل مضمون نئی شاعری اور نامقبول شاعری بظاہر تو غالب اور حالی کی نامقبول شاعری سے شروع ہوتا ہے لیکن اس کی تان نئی شاعری پر ٹوٹتی ہے۔ ان کے ابہام پر مضامین بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ روایت کا احیا مغربی علوم کی تردید اور رومانیت کی تلاش ایک رد عمل تھا۔ چنانچہ سلیم احمد کی تنقید کا بیشتر حصہ دوسرے نقادوں کی تردید پر مشتمل ہے۔۸

انیس ناگی سلیم احمد کی تنقید کا ایک رجحان غیر معمولی عنوانات کے ذریعے قاری کو چونکا دینا اور اپنے آپ کو غیر معمولی ثابت کرنا قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ سلیم احمد کے مضامین ''نئی نظم اور پورا آدمی'' اور ''گڈ بائے سرسید'' کو اس ذیل میں رکھتے ہوئے محض الفاظ کی بازی گری قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح حسرت موہانی کے حوالے سے جنسی تعلق کی حمایت اور حالی کے مولویانہ عشق کی مذمت کو بھی اسی نوعیت کے مضامین کی فہرست میں شمار کرتے ہیں۔

سلیم احمد کی کتاب ''نئی شاعری اور نامقبول شاعری'' اٹھارہ مضامین پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں اُن کے تمام ابتدائی مضامین دراصل دو ایک بنیادی موضوعات سے نکلے ہیں، جن پر یا تو اُنھوں نے خود قلم اُٹھایا، یا پھر کسی اور کے اٹھائے ہوئے کسی سوال پر بات آگے بڑھائی تھی۔ اس جواب در جواب یا وضاحت در وضاحت کے عمل نے

بے حد متنوع خیالات اور بعض اہم نکات کی صورت اختیار کر لی۔ یوں نئی شاعری، نامقبول شاعری کئی اقساط پر مشتمل مضامین کا ایک طویل سلسلہ ہے۔

سلیم احمد اس کتاب کے صفحہ نمبر ۹۳ سے لے کر صفحہ نمبر ۵۹ اتک محیط اس مضمون کی ابتدا ہی طے شدہ فیصلے سے کرتے ہیں کہ نئی شاعری کی تمام قسموں میں، ان کے تنوّع اور اختلافات کے باوجود ایک چیز مشترک ہے، نامقبولیت۔ نئی شاعری تمام کی تمام نامقبول شاعری ہے۔ پھر اس فیصلے یا نظریے کو منوانے یا تسلیم کروانے کے لیے بہ تکرار چند نکات کو دہراتے چلے گئے ہیں۔

سلیم احمد نئی شاعری سے مراد وہ نظمیہ شاعری لیتے ہیں جو میرآجی اور راشدؔ سے شروع ہو کر افتخار جالب اور پھر وہاں سے نیچے اُتر کر پروز پوئم تک پہنچتی ہے، اور تمام کی تمام نامقبول شاعری کی تعریف میں آتی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے غالبؔ اور ذوقؔ کی مثال دیتے ہوئے بتایا کہ غالبؔ اپنے عہد میں نسبتاً کم مقبول شاعر تھا لیکن اب مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ چکا ہے، جبکہ ذوقؔ اپنے زمانے کا مقبول ترین شاعر تھا، اب نامقبول ترین شاعر ہے۔ اس کے علاوہ اقبالؔ کی شاعری بھی مقبولیت، زیادہ مقبولیت اور انتہائی مقبولیت کے کئی مراحل سے گزری ہے۔ پھر فیضؔ اور اختر شیرانی کی مثالیں دینے کے بعد انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ کسی بھی شاعری کو مستقل طور پر نامقبول یا مقبول نہیں قرار دیا جا سکتا لیکن نئی شاعری کل بھی نامقبول تھی، آج بھی نامقبول ہے اور کل بھی نامقبول ہی رہے گی کیونکہ اس کی نامقبولیت اس کی فطرت کا ایک لازمی، جوہری اور دائمی عنصر ہے۔ اس حوالے سے سلیم احمد نے میرآجی کی نظم ''اونچا مکان''، افتخار جالب کی نظم ''قدیم بنجر'' اور ضیا جالندھری کی نظم ''بشارت'' کا ذکر کرتے ہوئے یہ بیان دیا کہ اگر کبھی اول الذکر دو شعرا کی یہ نظمیں مقبول شاعری کے زمرے میں شامل ہوئیں تو یہ یقیناً فن کی دنیا کا معجزہ ہی کہلائے گا۔

مضمون کی ابتدا میں نئی شاعری کے حوالے سے سلیم احمد نے جو بات فیصلے کی صورت میں کہی بعد ازاں اُسے ایک سوال کی شکل میں تبدیل کر کے طویل بحث کا آغاز کیا مگر بات پھر وہیں کی وہیں رہی اور مضمون کے وسط آخیر میں وہ سجاد میر اور ضیا جالندھری سے مخاطب ہوتے ہوئے نئی شاعری سے متعلق اپنے خیالات و نظریات کی وضاحت پیش کرتے ہیں۔ مضمون کے اس حصے سے ایک اقتباس بطور نمونہ درج ذیل ہے:

> میں نے یہ مضمون نئی شاعری پر منفی حملہ کے لیے نہیں لکھا اور نہ میں نئی شاعری کو اب یا کسی بھی وقت ''ناشاعری'' یا ''نامقبول شاعری'' قرار دینا چاہتا ہوں۔ اس کے برعکس اس مضمون کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ ان لوگوں کو جو اپنی زبان کے تخلیقی مسائل سے دل چسپی

رکھتے ہیں اور اپنی شاعری میں نئے تجربات کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں، انھیں ماضی اور حال کی روشنی میں یہ دیکھنے کی دعوت دی جائے کہ معاشرہ نئی شاعری اور اس کے تجربات کے بارے میں کیا رویہ رکھتا ہے۔ تاکہ اس رویہ کے تجزیہ کے ساتھ ایک طرف معاشرہ کو سمجھا جا سکے، دوسری طرف نئی شاعری کی ماہیت، فطرت اور طریقہ کار پر غور کیا جا سکے اور پھر ان دونوں کے درمیان افہام و تفہیم کا دروازہ کھولا جا سکے۔۹

اس کے بعد سلیم احمد نے نئی شاعری کو ترقی پسند شاعری سے الگ کرتے ہوئے اپنے نقطہ نظر کا اظہار کیا کہ ترقی پسند اور رومانی شاعری نے خواہ غزل ہو یا نظم عوام کو یقین دلایا تھا کہ فن عوام ہی کے لیے ہوتا ہے جبکہ نئی شاعری نے انھیں یہ تسیم کرنے پر مجبور کر دیا ہے کہ عوام، عوام کے علاوہ اور کچھ نہیں اور فن ایک اختصاصی صلاحیت چاہتا ہے لہٰذا نئی شاعری عمیق معنوں میں نامقبول شاعری ہے۔ اس کے علاوہ وہ نئی شاعری کی نامقبولیت کے تین بنیادی اسباب نئی ہئیت کا استعمال، نئی شعریت کا استعمال اور انسانی عناصر کا غائب یا گم ہونا یا چُھپ جانا گردانتے ہیں۔

سلیم احمد کے نئی شاعری کو نامقبول شاعری قرار دینے کے کل سات دلائل یا نکات ہیں جن کی وضاحت اس پورے طویل مضمون میں بہ تکرار کی گئی اور مضمون کے اختتام پر ان نکات کو اختصار کے ساتھ ایک بار پھر دہرایا گیا ہے۔

سلیم احمد کو تدریسی تنقید سے بہت چِڑ تھی۔ اسی لیے وہ تدریسی تنقید والوں کا مضحکہ اُڑاتے رہتے تھے۔ اسی احساس نے اُنھیں اُردو کے کئی تدریسی ناقدین سے برتر کر دیا تھا۔ تدریسی تنقید کی کالجوں اور یونیورسٹیوں کی سطح پر خواہ کچھ بھی اہمیت ہو اور ادب کی تعلیم و تفہیم میں اس سے کتنی ہی مدد کیوں نہ ملتی ہو۔ سلیم احمد اسے معمولی، حقیر اور ادنی درجے کی چیز سمجھتے تھے۔ وہ اس حوالے سے کھل کر اظہارِ خیال بھی کرتے تھے۔

سلیم احمد فطری طور پر بُت شکن واقع ہوئے تھے اور عموماً ادبی مسلمات اور تسلیم شُدہ اقدار کے خلاف لکھتے رہتے تھے، جس کے باعث اُنھوں نے بہت سے لوگوں کو ناخوش اور بہت کم لوگوں کو خوش کیا تھا۔ اُن کے نزدیک ادب کی کسی صنف کو صرف معقولیت کا اظہار نہیں ہونا چاہیے۔ ان میں کسی اضطراب کی تلاش کا، جمی جمائی چیزوں کو اُلٹ پلٹ کر دینے کا عنصر ہونا چاہیے۔

سلیم احمد کو شکایت تھی کہ اُردو تنقید مصلحتوں کا شکار ہے اور اردو تنقید سچ بولنے کو گناہ سمجھتی ہے۔ سلیم احمد کے دل میں جو آتا تھا وہ برملا لکھ ڈالتے تھے اور نجی اور دوستانہ تعلقات کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ سلیم احمد ادیب

کے سچے ہونے پر بہت زور دیتے تھے۔ وہ ادیب کے بیک وقت ادیب اور منافق یا ادیب اور زر پرست ہونے کو غلط سمجھتے تھے۔ اُن کا موقف یہ تھا کہ اگر آپ ادیب رہنا چاہتے ہیں تو پھر اپنے زمانے کی سچائیوں کو بے نقاب کریں اور اپنے نفس اور معاشرے کے بارے میں سچائی سے کام لیں خواہ اس کی کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔ کیونکہ ادب کی تخلیق الفاظ کی تجارت نہیں ہوتی بلکہ ایک طرزِ زندگی ہے۔

سلیم احمد ادب کو طرزِ حیات تصور کرتے تھے اور ادیب کی ادب سے مکمل وابستگی ضروری خیال کرتے تھے۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے اپنے عزیز احباب جمیل الدین عالی اور نظیر صدیقی کو بھی نہیں چھوڑا۔

شہزاد منظر سلیم احمد کی تنقید نگاری کو ان الفاظ میں سراہتے ہیں:

> سلیم احمد کو میں جدید اُردو تنقید میں اس لیے اہمیت دیتا ہوں کہ نظریاتی اختلافات کے باوجود وہ جینو ین ادیب ہیں اور ادب کے ضمن میں قطعی مُخلص۔ وہ نظریے کو ادب پر ترجیح نہیں دیتے اور ادبی اور نظریاتی اختلافات کے باوجود ادبی تخلیقات کو ایمانداری کے ساتھ پرکھتے ہیں۔ ان سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی اہمیت سے انکار نہیں۔ ۱۰

سلیم احمد اُردو کے اُن معدودے چند ادیبوں میں سے ہیں، جنھوں نے اپنی زندگی ادب اور صرف ادب کے لیے وقف کر دی تھی اور اسی کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیا تھا۔ سلیم احمد کی طرح اُردو میں بہت کم اس قدر مُخلص ادیب ملتے ہیں۔ اُن کا ماننا تھا کہ ادیب اول و آخر ادیب ہی ہوتا ہے۔ اس کے بعد اسلام پسند یا غیر اسلام پسند اور ترقی پسند یا غیر ترقی پسند۔ اس لیے ادب کو ادبی بنیادوں پر پرکھنا چاہیے، محض نظریے کی بنیاد پر نہیں۔ اُن کا تمام جدیدیت پسند ادبا سے اختلاف اس بات پر تھا کہ وہ نظریاتی وابستگی کے قائل نہیں، مگر اس کے باوجود وہ ادب کی بنیادی اقدار کو نظریات و تصورات سے آمیز کرنے قائل نہیں تھے۔ ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند ادیبوں سے اختلافات کے باوجود وہ فیضؔ، عصمت چغتائی، کرشن چندر اور دیگر ترقی پسند ادبا کے فن کے قدر دان تھے اور ان کے فن کی کھل کر تحسین کرتے اور جہاں کہیں اختلاف ہوتا، اس کا بھی برملا اظہار کرتے۔ سلیم احمد نے شاعری، صحافت، ڈرامے اور تنقید میں وہ کارنامے انجام دیے ہیں، جن کا اثر موجودہ زمانے پر بھی گہرا پڑا اور ان کا رشتہ آنے والے زمانے سے بھی مضبوطی سے پیوستہ ہے۔

سلیم احمد کے جدید دور کے اہم ناقدین میں شمار کیے جانے کا بنیادی سبب اُن کا ادبی تخلیقات کے حوالے سے معروضی نظریہ، اُن کی نکتہ سنجی، اُن کا منفرد نقطہ نظر، عمیق فکر اور اُن کی اپنی تشریح اور تعبیر ہے۔ تنقید میں بنیادی اہمیت نقطہ نظر اور ادبی بصیرت کی ہوتی ہے اور یہ دونوں اوصاف سلیم احمد کی تنقید نگاری کا خاصہ ہیں۔ اُنھوں نے

جیسے اپنی منفرد سوچ اور فکر سے نئے نئے سوالات اُٹھائے، تعصّبات اور ذاتی پسند ناپسند سے ہٹ کر صداقت کو رواج دیا اور تنقید نگاری میں ذاتی نقطہ نظر کی اہمیت کو اُجاگر کیا، اُن کی اوریجنل نقاد ہونے میں کوئی شُبہ باقی نہیں رہتا۔

حوالہ جات

۱۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر، ''طرفیں''، لاہور: قوسین، ۱۹۸۲ء، ص، ۱۶۳۔

۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ''، لاہور: سنگمیل پبلی کیشنز، ۱۹۷۱ء، ص، ۲۲۶۔

۳۔ سلیم احمد، ''نئی نظم اور پورا آدمی''، کراچی: ادبی اکیڈمی، جون ۱۹۶۲ء، ص، ۱۳۔

۴۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر، ''طرفیں''، لاہور: قوسین، ۱۹۸۲ء، ص، ۱۶۷۔

۵۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر، ''طرفیں''، ص، ۱۷۰۔

۶۔ سلیم احمد، ''اقبال-ایک شاعر''، لاہور: نقشِ اول کتاب گھر، ۱۹۷۸ء، ص، ۱۹۔

۷۔ سلیم احمد، ''نئی نظم اور پورا آدمی''، ص، ۵۱۔

۸۔ انیس ناگی، ''پاکستانی اردو ادب کی تاریخ''، لاہور: لاہور: جمالیات، ۲۰۰۴ء، ص، ۳۵۔

۹۔ سلیم احمد، ''نئی شاعری نامقبول شاعری''، کراچی: نفیس اکیڈمی، اگست ۱۹۸۹ء، ص، ۱۰۲۔

۱۰۔ شہزاد منظر، '' پاکستان میں اُردو تحقیق کے پچاس سال''، کراچی: منظر پبلی کیشنز، طبع اول، ۱۹۹۶ء، ص، ۱۹۰۔